© rasailojaraid.com

جناب مقبول بیگ بدخشانی

حافظ شیریں سخن آدمِ نو کے انتظار میں

علامہ اقبال کی کتاب اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں حکیم افلاطون کے خیالات سے متعلق ایک نظم نظر سے گزری تھی۔ اردو میں اس کا عنوان یوں تھا:

"افلاطون یونانی کا اثر غیر معمولی طور پر اقوام اسلامیہ کے تصوف و ادبیات نے قبول کیا، یہ افلاطونی افکار ہی کا اثر تھا، جس نے مسلک گوسفندی کی شکل اختیار کی، ایسے افکار سے پرہیز لازم ہے۔"

اس عنوان کے تحت علامہ نے حافظ شیراز کے متعلق بھی کچھ شعر لکھے تھے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

هوشیار از حافظ صهبا گسار ... جامش از زهر اجل سرمایه دار
رهنِ ساقی خرقهٔ پرهیز او ... مے علاجِ هولِ رستاخیز او
محفلِ او درخورِ ابرار نیست ... ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گزر ... الحذر از گوسفندان الحذر

اسرارِ خودی کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا تو اس میں حافظ سے متعلق شعر حذف کر دیے گئے تھے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ علامہ صاحب نے حافظ سے متعلق ان خیالات کا اظہار کس صورت میں کیا، نہ ہی اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے کہ ان اشعار کو اسرارِ خودی سے خارج کیوں کیا گیا، لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ رائے بدلنے کی ضرورت ہو تو انسان اپنی رائے کو کسی تجزیے کے بعد یا مزید غور و فکر کی روشنی میں دیکھتا ہے جس سے ذہنی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اس تبدیلی سے پہلا تصور زائل ہو جاتا ہے اور اس کا متضاد تصور ابھرتا ہے جسے ہم ہیگل کی زبان میں dialectical process یا خود اپنے الفاظ میں جدلی عمل کہہ سکتے ہیں۔ علامہ صاحب نے اپنی پہلی رائے یقیناً حافظ کے ایسے اشعار کی بنا پر قائم کی جن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جبریت، حالاتِ زمانہ سے گریز و فرار، در میخانہ پر دستک، خال و رخِ محبوب کی توصیف، گوشۂ تنہائی کی تمنا اور اس قسم کے انفعالی خیالات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پھر علامہ نے تجزیے اور مزید مطالعے سے یقیناً ایسے شعر بھی دیکھے، جن میں حافظ نے آبرومندانہ زندگی کے لیے جدوجہد کی تلقین کی ہے، امید پسندی کا درس دیا ہے، اپنے افعال پر قادر ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قوم کی خوابیدہ امنگوں کو بیدار کیا ہے، دعائے نیم شبی اور دردِ سحرگاہی کی تلقین کی ہے اور پھر جگہ جگہ روشن مستقبل کی بشارت بھی دی ہے حافظ کے ایسے خیالات کے پیشِ نظر ممکن ہے علامہ صاحب نے اپنی رائے بدل دی ہو اور اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن میں حافظ سے متعلق مذکورہ اشعار خارج کر دیے ہوں۔ ایک مثال ہمارے سامنے ہے کہ علامہ صاحب کی نظم "شکوہ" پر کسی زمانے میں بہت احتجاج ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی، البتہ "جواب شکوہ" نظم لکھی جس سے لوگوں کی زبان بند ہو گئی، لیکن حافظ کے متعلق انھوں نے یقیناً رائے بدل دی اور ان سے متعلق نظم خارج کر دی۔

حافظ سرزمینِ ایران کے بلند نظر اور وسیع الخیال شاعر تھے، انھوں نے انتہائی پُرآشوب دَور میں زندگی گزاری۔ اس دور کے متعلق حافظ کے ہم وطن ادیب اور نقاد محمد جمال زادہ لکھتے ہیں: "کہ حافظ کی زندگی ایسے لوگوں میں گزری، جو خون خوار، خون ریز اور خون آشام تھے۔ حافظ نے خونین ماحول سے فرار چاہا اور اپنی خداداد بصیرت اور فطری ذوق کی مدد سے ہر اس چیز سے تعلق قائم کیا جس سے ان کی روح کو اطمینان اور سکون میسر ہو۔ انھوں نے جمالِ فطرت کی طرف رجوع کیا۔ کائنات اور کائنات کے اندر جو کچھ ہے، اس کے مطالعے سے لذت یاب ہوئے، چنانچہ ان کے کلام میں شراب و شباب، سبزہ و گل، خال و رخ اور ساز و آواز کا اکثر ذکر آیا ہے"۔

جمال زادہ نے حافظ کی شاعری کے جو عناصر بیان کیے ہیں، وہ تو ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں، بلکہ ان کی شاعری کی روح ہیں، لیکن ایک اور عنصر جس پر نہ جمال زادہ نے توجہ دی نہ ان کے کسی اور اہلِ وطن نے نظر ڈالی یہ ہے کہ حافظ نے جہد للحیات یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

struggle for existence کو بھی مقصدِ حیات سمجھا۔

حافظ کے ان دونوں پہلوؤں یعنی فرار و گریز اور جہد للحیات کے بیان کے لیے سیاسی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس دور کے سیاسی حالات مختصر طور پر بیان کردوں۔ حافظ نے جب ہوش سنبھالا تو ایران کا صوبہ فارس، جہاں کے شہر شیراز کے وہ رہنے والے تھے، تخریب و ہلاکت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، سکون و عافیت ناپید اور اضطراب و اضمحلال عام تھا، طوائف الملوکی اور لوٹ مار روز و شب کی بات تھی۔ ایک حکمران قتل ہوتا تو دوسرا تخت و تاج سنبھالتا، ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ اسے یہ مسند کسی دوسرے کے لیے خالی کرنی پڑتی۔ اس کے علاوہ قہرِ خداوندی وبا کی صورت میں اہلِ فارس کو گھیرے رہا۔ اس انقلاب پذیر زمانے میں حافظ نے متعدد سفاک حکومتیں بھی دیکھیں اور کمزور حکومتیں بھی۔ بعض حکمرانوں نے ان کی قدردانی بھی کی۔ ان کی قدردانی کرنے والا حکمران ابواسحاق اینجو تھا۔ ابواسحاق فارس کا گورنر تھا، جسے منگول بادشاہ غازان خاں نے مقرر کیا تھا۔ شیراز اس کا صدر مقام تھا۔ ابواسحاق خود ایک خوش فکر شاعر تھا اور شاعروں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ عیش پسند اور عافیت کوش بھی تھا۔ اس کی عشرتوں کے فسانے یزد کے حکمران مبارز الدین کے کانوں تک پہنچے تو اس نے ۷۵۸ھ کے موسم بہار میں شیراز پر فوج کشی کی۔ ابواسحاق کو اس کی پیش قدمی کی اطلاع ہوتی، تو کہنے لگا اس سے بڑا احمق کون ہوگا، جو موسم بہار کو یوں ضائع کردے۔ آج کی رنگین رات کو فکرِ فردا میں کھو دینا کہاں کی دانشمندی ہے، یہ شعر بھی کہا:

بیا تا یک امشب تماشا کنیم ... چو فردا شود فکرِ فردا کنیم

مبارز الدین نے یزد میں اپنے والد مظفر الدین بن منصور کے نام پر مظفری عہدِ حکومت کی بنیاد ڈالی، اور اب ابواسحاق اینجو پر فتح پا کر شیراز اور کرمان کے علاقے بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیے۔ مبارز الدین سخت گیر شخص تھا، اس نے شیراز کی حکومت سنبھالتے ہی نہایت کڑی قیود عاید کردیں۔ شیراز کے اربابِ ذوق جا و بے جا سختیوں کی بنا پر اسے محتسب کہہ کر پکارتے تھے، خود اس کے بیٹے شاہ شجاع نے طنزیہ شعر کہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک شعر درج ذیل ہے:

رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند
جز محتسبِ شہر کہ بے مے مست است

مبارز الدین نے آس پاس کے علاقوں میں بھی خوں ریزی کر کے سلطنت کو وسعت دی۔ زندگی کچھ اور مہلت دیتی تو اہلِ وطن کا اور بھی خون بہاتا۔ یہ بے حد تند مزاج اور ستم پیشہ شخص تھا۔ اس کے دونوں بیٹوں شاہ شجاع اور شاہ محمود نے بغاوت کر دی۔ آخر جب شاہ شجاع نے باپ کو مغلوب کر لیا تو اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائی پھیر دی گئی اور اس طرح اس کی کشور کشائی کی تمنا خاک میں مل گئی۔

حافظِ شیراز بہت حساس شاعر تھے، انھیں مبارز الدین کی سخت گیریوں کا تو احساس تھا لیکن ایک انسان کی روشن آنکھیں بے نور دیکھیں تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔ اس سنگ دل اور شقی القلب پر ایک نظم میں یہ کہہ کر اظہارِ درد بھی کیا:

دل منہ بر دُنیی و اسبابِ او
زانکہ از اُو کس وفاداری ندید
آنکہ روشن شد جہان بینش بدو
میل در چشم جہاں بینش کشید

مبارز الدین کے بعد شاہ شجاع تخت نشین ہوا۔ اکثر باتوں میں وہ باپ کی ضد تھا۔ وہ دوسرا حکمران تھا جس نے ابو اسحاق اینجو کے بعد حافظ کی سرپرستی کی اور انھیں کچھ عرصے کے لیے غمِ دوراں کو بھلانے کا موقع ملا۔ شاہ شجاع ادبی ذوق بھی رکھتا تھا، شاعروں کی صحبت کو بھی پسند کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں تمام معاشرتی پابندیاں، جو اس کے باپ نے عاید کر رکھی تھیں، ختم کر دی گئیں۔ حافظ نے غمِ دوراں کو کچھ وقت کے لیے بھلاتے ہوئے کہا:

شد آنکہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش

وہ زمانہ ختم ہوا جب اہلِ نظر الم ناک واقعات کو دیکھ دیکھ کر ہزار طرح کی باتیں کہنا چاہتے تھے، لیکن انھوں نے لبوں پر مہرِ سکوت لگا کر کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

شاہ شجاع آلِ مظفر کا ایک مدبّر اور قوی حکمران تھا۔ اس کے عہد میں ایک حد تک امن و امان قائم رہا، دلوں کی جراحت کا کچھ مداوا ہوا۔ حافظ نے اس دور کا خیر مقدم کرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا تھا :

بہ بانگِ چنگ بگوییم آں حکایتہا　　　کہ از شنیدنِ آن دیگِ سینہ میزد جوش

یعنی اب واقعات نے رُخ بدلا ہے، وہ دبی دبی شکایتیں، جنھیں سن کر کبھی سینۂ آدم ابل ابل پڑتا تھا، اب چنگ و رباب کے ساتھ کہی جائیں گی۔

یہ پُرامن دور خاصی مدت تک قائم رہا، لیکن ۷۸۶ھ میں شاہ شجاع کی وفات کے ساتھ ہی سکون و عافیت کا پیغام لانے والا یہ دور ختم ہو گیا۔ شاہزادوں میں اب کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ باپ کے نقشِ قدم پر چل کر مستحکم حکومت قائم کر سکے، لیکن حکمران بننے کے خواب سبھی دیکھتے تھے، وہ ایک دوسرے کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے تھے۔ آخر زین العابدین شاہ شجاع کا جانشین بنا۔ یہ کمزور حکمران تھا۔ اس کی کمزوری سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا، جاہ پسند خودسر ہو گئے، ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا، لوٹ مار اور قتل و غارت کی وجہ سے سب ملک کے طول و عرض میں ہراس اور سراسیمگی پھیلی۔ اس کے عہد میں شیراز اور اس کے گرد و نواح میں قحط پڑا، وبا پھوٹی اور طرح طرح کے مصائب ٹوٹے، جن سے ملک کا امن و سکون غارت ہوا، نہ حکمران میں یہ صلاحیت تھی کہ عوام کا مداوا کر سکے نہ عوام میں یہ سکت تھی کہ اپنے آپ کو سدھارنے کی فکر کریں۔ معاشرے کی حالت اس پھوڑے کی سی ہو گئی تھی، جسے کسی ماہر نشتر زن کی ضرورت ہو۔ حافظ رہ رہ کر اپنی تمنا کا اظہار اس طرح کرتے :

مردے از غیب برون آید و کارے بکند

انھیں کسی مردِ غیب کا، جسے وہ آدمِ نو کہتے ہیں انتظار تھا، وہ چاہتے تھے کہ یہ مردِ غیب قوم کو جھنجھوڑے، ملک کو سنبھالے اور عوام کو راہ پر لگائے۔

آخر ایک مردِ غیب آتا بھی ہے تو اس طرح کہ ماوراالنہر اور ترکستان کو روندتا ہوا بنی نوعِ انسان کا خون بہاتا ہوا، پہلے وہ آذربائیجان کا علاقہ فتح کرتا ہے اور جیسا کہ اس کی وحشت پسند طبیعت کا خاصہ تھا، فتح کرنے کے بعد اس نے شہریوں کے گلے کاٹ کر لاشوں کے انبار بھی کھڑے کیے، یہ امیر تیمور تھا۔ وہ شیراز میں داخل ہوا تو یہاں بھی اس نے بہت تشدد کیا۔

تیمور نے ہرچند حافظ کی قدر کی، لیکن ان کے سامنے قاہر حکمران کی یہ عزت افزائی نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی بلکہ اپنی بےبس قوم تھی جس کے سینے درد و الم کی آماجگاہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا ہاتھ گریبان پر ہے اور صدائے درد زبان پہ آکر رکی ہوئی ہے :

گریہ از آتشِ دل چوں خُمِ مے در جوشم　　　مُہر بر لب زدہ خوں میخورم و خاموشم

حافظ کے لبوں پر مُہر ہے، خونِ جگر پی پی کے رہ جاتے ہیں لیکن آتش دل کی حرارت سے وہ خم مے کی طرح جوش میں ہیں ـــــ جوش ایک ولولہ ہے، جسے ناموافق حالات نے دبا رکھا ہے۔ بہرحال خم مے کا جوش زندگی اور عمل کی علامت ہے۔ وہ شخص کہ بقول خود، فردوسِ بریں اس کا مقام تھا، فرشتوں کے سانس اسے ملول کر دیا کرتے تھے، ماہ و پروین سے اس کا راز و نیاز تھا، وہ اب دیو سیرت لوگوں میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے، لیکن حوصلہ نہیں ہارتا اور قوم کی ہمت بڑھاتا ہے، انھیں تلقین کرتا ہے کہ امید رکھو، بہتر حالات کی امید میں رہو، امید کا دروازہ اپنے آپ پر بند نہ کرو۔ خداوند تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ زمانہ ایک سا نہیں رہتا :

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند　　　چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

جب زمانہ ایک سا نہیں رہتا تو ہمیں کسی بہتر زمانے سے نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ کہتے ہیں :

نفسِ بادِ صبا مُشک فشاں خواہد شد　　　عالمِ پیر دگر بارہ جوان خواہد شد

ایں تطاول کہ کشید از غمِ ہجراں بُلبل　　　تا سرا پردۂ گل نعرہ زناں خواہد شد

حافظ کو جہاں پریشانیوں کا سامنا ہے، وہاں اپنے آپ پر اعتماد بھی ہے، زندگی حسرت و یاس کی رات تو ہے، لیکن اس میں شعاعِ امید بھی ہے، وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور کہتے ہیں :

صبحِ امید کہ بُد معتکفِ پردۂ غیب　　　گو برون آ کہ کارِ شبِ تار آخر شد

امید کی صبح جو اس وقت پردۂ غیب میں اعتکاف میں ہے، اسے کہہ دو کہ تاریک رات کا کام ختم ہو گیا ہے اب پردۂ غیب سے باہر آ جائے۔

قوموں کے اسباب زوال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں ترقی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صلاحیت سے محروم ہو جائے، جو قوم نفاق اور انتشار کا شکار ہو جائے، جو قوم عیش و عشرت میں اپنی کمزوری کے نتیجے سے غافل ہو جائے، اس کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔ حافظ اپنی قوم کو اس طرح تنبیہ کرتے ہیں :

دیدی آن قہقہۂ کبکِ خراماں حافظ — کہ ز سرپنجۂ شاہین قضا غافل بود

یعنی کبکِ خراماں جو پنجۂ شاہیں کی گرفت سے غافل ہے اور قہقہے لگاتا پھرتا ہے اس کا انجام صاف ظاہر ہے۔ اس قسم کے حالات میں علامہ اقبال نے قوم کو اس طرح تنبیہ کی ہے :

دلِ شاہیں نلرزد بہرِ آن مرغے کہ در چنگ است — ز نادان امید سازگاری باز افرنگ است

حافظ جد و جہد کو زندگی کا راز سمجھتے ہیں۔ دنیا میں وہی قومیں سرفراز ہوتی ہیں، جو جد و جہد کو عین حیات سمجھتی ہیں، جو لوگ غفلت، کاہلی اور بے عملی کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں اور تقدیر کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، وہ زندگی کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے، حالانکہ انسان زندگی کی جد و جہد میں حصہ لے کر اپنی تقدیر خود بناتا ہے اور مزید جد و جہد سے اپنی تقدیر کو بدلتا بھی رہتا ہے۔ حافظ یہی وعظ قوم کو سناتے ہیں اور امید و مراد کے راز سے آگاہ کرتے ہیں :

قومے بجد و جہد گرفتند وصلِ دوست — قومِ دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند

ایک ایسی قوم ہے جو جد و جہد سے امید و مراد کو حاصل کر لیتی ہے لیکن ایسی قوم بھی ہے جو اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

بہرحال حافظ اپنی قوم سے ناامید نہیں۔ وہ قوم کے گزشتہ زریں کارناموں سے آگاہ ہیں اور اپنی قوم کو آبا کے کردار سے آگاہ کرانا چاہتے ہیں۔ قوم کی عظمتِ گزشتہ کی تاریخ ان کے سامنے ہے، تاریخ کے اوراق قوم کو دکھانا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال کی طرح انھیں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حافظ مٹی کو زرخیز تو سمجھتے ہیں لیکن اس کے اندر نمی وہ خود پیدا کرنا چاہتے ہیں :

غبارِ غم برود حال خوش شود حافظ   تو آب دیدہ ازیں رہگذر دریغ مدار

یعنی غم کا غبار چھٹ جائے گا، آسودگی پیدا ہو جائے گی۔ حافظ! تم اس رہگذر پر آنسو بہانے سے دریغ نہ کرو۔

حافظ ہمیں بتاتے ہیں کہ قدرت کی گراں بہا نعمتیں انسانوں کے لیے ہیں اور یہ نعمتیں جا بجا موجود ہیں، کچھ ظاہر ہیں اور کچھ مخفی۔ نعمتیں حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر ہی ان تک پہنچ سکتے ہیں، وہ نعمتیں کچھ بھی ہو سکتی ہیں۔ ان نعمتوں کو حافظ نے علامت کے طور پر لعل و گہر کا نام دیا ہے، فرماتے ہیں :

طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید   ہمچناں در عملِ معدن و کانست ہنوز

یعنی لعل و گہر کا کوئی طالب ہی نظر نہیں آتا، ورنہ خورشید عالم تاب کا عمل زمین کی آغوش میں چھپی ہوئی معدنیات پر بدستور جاری ہے۔ اس کے عمل ہی سے سنگ ریزے لعل و گہر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

ان نعمتوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے میں ایسی صلاحیت پیدا کی جائے کہ ہاتھ ان نعمتوں تک پہنچ سکے۔ ہر شخص اس کا اہل بھی تو نہیں ہوتا :

ذرّہ را تا نبود ہمتِ عالی حافظ   طالبِ چشمۂ خورشیدِ درخشاں نشود

حالاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے حافظ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کا سفر بہت کٹھن ہے۔ قدم قدم پر مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن زندگی کے سفر میں جن لوگوں کی ہمت جواں، ارادے مستحکم اور حوصلے بلند ہوتے ہیں، انھیں تو منزل ہی کا خیال ہوتا ہے، منزل کے نشیب و فراز کو وہ خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ کہتے ہیں :

ز مشکلاتِ طریقت عناں متاب اے دل   کہ مردِ راہ نیندیشد از نشیب و فراز

اور پھر دیکھیے وہ منزل جہاں راہِ طریقت کے مسافر کو پہنچنا ہے، اسے حافظ نے کتنے تقدس کا درجہ دیا ہے :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دربیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم　　　سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

یعنی زیارتِ کعبہ کے شوق میں اگر قدم بیاباں میں رکھتے ہو تو راہ کے کانٹوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ منزل حافظ کے سامنے ہے، اس تک پہنچنے کے لیے انھوں نے خود اپنے فکر و خیال کی تہذیب کے لیے ریاضت کی اور اہلِ وطن کو بتایا کہ ان کی ریاضت، ترکِ ریا اور خلوصِ دل کے حصول کے لیے ہے۔ کہتے ہیں:

ہر گنجِ سعادت کہ خدا داد بحافظ　　　از یمنِ دعائے شب و وردِ سحری بود

حافظ کے دل میں قوم کا درد ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت افرادِ قوم پر واضح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود ہمت نہیں ہارتے۔ ان کا دل اہلِ وطن کو رنج و بلا میں مبتلا دیکھ کر کڑھتا ہے۔ انھیں حکمران طبقے کے ساتھ راہ و رسم بھی ہے لیکن یہ روگ نہ حکمران کے بس کا ہے، نہ شاعر کے بس کا، اس لیے یہ حساس شاعر، کسی مردِ آہن، کسی فوق البشر، کسی آدمِ نو کی راہ دیکھتا ہے اور اپنے نغموں کے ذریعے اس کی آمد کے لیے راستہ بھی ہموار کرتا ہے کہ شاید وہ ایران اور اہلِ ایران کی قسمت کا پانسہ پلٹ دے۔ حافظ کے ان اشعار سے ان کے داخلی ہیجان کا پتا چلتا ہے:

سینہ مالا مالِ درد است اے دریغا مرہمے　　　دل ز تنہائی بجاں آمد خدا را ہمدمے
چشمِ آسائش کہ دارد از سپہرِ تیز رو　　　ساقیا جامے بمن دہ تا بیاسایم دمے

حافظ کسی ہمدم، کسی آدمِ نو کے منتظر اور جہانِ نو کی تخلیق کے آرزومند ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

آدمی در عالمِ خاکی نمی آید بدست　　　عالمِ دیگر بباید ساخت وز نو آدمی

اس عالمِ خاکی میں کوئی انسان نظر نہیں آتا، اب ضرورت ہے کہ کوئی نیا آدم عالمِ وجود میں آئے اور کوئی نیا جہان تخلیق ہو۔

شاید اسی قسم کے حالات علامہ اقبال کے سامنے بھی تھے، وہ بھی حضرتِ انسان کی بے بسی، بے عملی اور بے اختیاری کو دیکھ کر اسی قسم کی آرزو کرتے ہیں جیسی حافظ نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار لُعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را

علامہ صاحب یہاں حافظ شیریں سخن کے ہم نوا بھی ہیں اور ہم سفر بھی۔

آدمِ نو سے حافظ کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ اسے ہم نشینی کے لیے بلاتے ہیں اور کہتے ہیں:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

آ کہ پھول برسائیں۔ جام مے میں مئے ارغوانی ڈالیں، آسمان کی وسعتوں سے گزر کر مہ و پروین تک پہنچیں۔ کائنات کے لیے نیا خاکہ تیار کریں اور نئی بنیادیں استوار کریں۔

طب العرب

ایڈورڈ جی براؤن ترجمہ: حکیم سید علی احمد نیّر واسطی

فاضل مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے لندن کے رائل کالج آف فزیشنز میں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء میں طبِ عربی پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں عریبین میڈیسن کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

پروفیسر براؤن نے اپنے ان چار خطبات کے ذریعے طبی ادب، عربی علمِ طب اور تاریخ علمِ طب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ خطبات علمی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور یورپ کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔

حکیم سید علی احمد نیّر واسطی نے اس مجموعہ خطبات کا انگریزی سے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور جابجا اپنی جانب سے مفید تشریحات اور علمی، فنی و تاریخی تنقیدات کا اضافہ کیا۔ اپنی تشریحات و تنقیدات میں فاضل مترجم نے نہایت قابلیت کے ساتھ جابجا پروفیسر براؤن کے بیانات کی محققانہ تشریح و توضیح کی ہے۔

صفحات ۵۵۲ قیمت -/۳۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۳

© rasailojaraid.com